بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ؕ

اشارات

جن لوگوں نے قرآن اور حدیث کا بنظرِ غائر مطالعہ کیا ہے وہ اس حقیقت سے بے خبر نہیں ہیں کہ اسلام کی نگاہ میں اصل اہمیت فرد کی ہے نہ کہ جماعت یا اجتماعی نظام کی۔ ہر ہر فردِ انسانی کو اللہ تعالیٰ نے شخصیت عطا کی ہے، خودی کا احساس دیا ہے، انفرادی خصوصیات بخشی ہیں، دیکھنے کے لیے آنکھیں دی ہیں سننے کے لیے کان دیئے ہیں، سوچنے، سمجھنے اور رائے قائم کرنے کے لیے دل دیا ہے، خواہش، تمیز، ارادے اور فیصلے کی قوتیں دی ہیں، اور اپنی ملکیت میں سے بہت سی چیزیں امانۃً اس کے سپرد کر کے ان پر تصرف کے اختیارات اسے عطا کیے ہیں۔ اس بنا پر ایک ایک انسان منفرداً اللہ کا خلیفہ ہے اور خلیفہ ہونے کی حیثیت سے ذمّہ دار اور جواب دہ ہے۔ یہی بات ہے جسے قرآن بار بار دہراتا ہے۔ كُلُّ نَفْسٍ بِمَا كَسَبَتْ رَهِينَةٌ۔ كُلُّ امْرِئٍ بِمَا كَسَبَتْ رَهِينٌ۔ لَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِزْرَ أُخْرَىٰ۔ لَيْسَ لِلْإِنْسَانِ إِلَّا مَا سَعَىٰ۔ لَا يُكَلِّفُ اللَّهُ نَفْسًا إِلَّا وُسْعَهَا، لَهَا مَا كَسَبَتْ وَعَلَيْهَا مَا اكْتَسَبَتْ۔ یہ سب اسی حقیقت کے اعلانات ہیں۔ اور اسی کو اس مشہور حدیث میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان فرمایا ہے کہ اَلَا کلکم راعٍ وکلکم مسئول عن رعیتہٖ۔ پھر اسی بات کو قرآن آخرت کے ذکر میں بکثرت بیان کرتا ہے کہ اللہ کی عدالت میں ایک ایک انسان انفرادی حیثیت سے اپنا حساب دیگا اور جو کچھ برائی یا بھلائی اس نے دنیا کی زندگی میں کمائی تھی اس کا نتیجہ دیکھے گا۔ یعنی جس طرح شخصیت انفرادی ہے اور ذمّہ داری انفرادی ہے اسی طرح نتیجہ و انجام بھی آخر کار انفرادی ہی ہے اور اس نتیجہ و انجام کے خوب یا زشت ہونے اور خوبی و زشتی کے مختلف مدارج میں سے کسی درجہ پر پہنچنے کا تمام تر انحصار اس پر ہے کہ اس نے دنیا کی زندگی میں کس قسم کی شخصیت اپنے اندر پرورش کی، کن صفات کا اکتساب کیا، کس طرح ان قوتوں سے کام لیا جو اللہ نے اسے دی تھیں، کس طرح اُس

امانت میں اپنے اختیارات استعمال کیے جو اللہ نے اسے سونپی تھی، اور اپنی تکمیل کے لیے اُن ذرائع سے کہاں تک فائدہ اٹھایا جو اسے حاصل تھے۔

پس یہ حقیقت ہے کہ اسلامی نقطۂ نظر سے فرد کی شخصیت کا ارتقاء اور اس کی ذات کی تکمیل بجائے خود مطلوب ہے۔ دین کا مخاطب فرد ہے، خدا کی عبدیت اور اطاعت کی طرف فرد کو دعوت دی گئی ہے، حقوق اور فرائض فرد پر عاید کیے گئے ہیں، امر و نہی کے احکام فرد کو دیے گئے ہیں، طاعت پہ جزا کی امید فرد کو دلائی گئی ہے اور عصیان پر سزا کی دھمکی بھی فرد ہی کو دی گئی ہے۔ اس نظامِ فکر و عمل میں فرد ہی وہ اصل اکائی ہے جس کو ابتدا میں عامل کی حیثیت سے اور انتہا میں نتیجۂ عمل پانے والے کی حیثیت سے بنیادی اہمیت حاصل ہے۔ اسی کی عقل اور جذبات سے یہ اپیل کرتا ہے، اسی کو اپنی ہدایت و رہنمائی کا مخاطب بناتا ہے، اسی کی فلاح کا طالب ہے اور اسی کو خسران سے بچانا چاہتا ہے۔ اگر فرد اپنی جگہ ناقص رہ جائے اور اپنی شخصیت کو پستی میں گرا دے تو آخری فیصلہ میں اُس جماعت اور اجتماعی نظام کی خوبی اس کے لیے کچھ بھی نافع نہیں ہو سکتی جس سے وہ دنیا میں تعلق رکھتا تھا، بلکہ اگر وہ کسی اچھی جماعت اور صالح اجتماعی نظام سے وابستہ تھا اور پھر اس نے اپنی تکمیلِ ذات اور ارتقاءِ شخصیت کے ان مواقع سے فائدہ نہ اٹھایا جو اسے حاصل تھے تو یہ چیز اس کے خلاف ایک اور قوی دلیل بن جائے گی اور اسے اور زیادہ خسران میں مبتلا کرے گی۔ بخلاف اس کے اگر وہ اپنی کوشش سے اس کمال کو پہنچ جائے جس کو وہ پہنچ سکتا تھا اور اپنی شخصیت کو اتنا بہتر نشو و نما دے جتنا وہ دے سکتا تھا، تو جماعت اور اجتماعی نظام کا فساد اس کی فلاح و نجات میں مانع نہیں ہو سکتا، بلکہ یہ چیز اس کے حق میں ایک دلیل ہو گی کہ اس نے ناموافق حالات میں ترقی کے لیے اتنی کامیاب جدوجہد کی۔ یہی معنی ہیں اس آیت کے جو سورۂ مائدہ میں ارشاد ہوئی ہے کہ علیکم انفسکم لا یضرکم من ضل اذا اھتدیتم۔ اور اس کے عکس کی صحت پر خود اسی آیت کا مضمون دلالت کرتا ہے یعنی یہ کہ لَا ینفعکم من اھتدیٰ اذا ضللتم۔

اس کا یہ مطلب نہیں کہ جماعت اور اجتماعی نظام کی صلاح اسلام کی نگاہ میں کوئی اہمیت نہیں رکھتی۔ فی الواقع اس کو بہت بڑی اہمیت حاصل ہے مگر اس حیثیت سے نہیں کہ وہ بجائے خود مطلوب ہے۔ بلکہ اس حیثیت سے کہ فرد کی شخصیت کا ارتقاء اور اس کی ہر ذات کی تکمیل جماعت ہی کی اصلاح اور اجتماعی نظام ہی کی بہتری پر منحصر ہے۔ اللہ تعالیٰ نے آدمیوں کو فرد فرد کی صورت میں پیدا تو ضرور کیا ہے مگر فرد فرد کی صورت میں رکھا نہیں ہے۔ ہر شخص اُس اجتماعی عمل کے نتیجہ میں پیدا ہوتا ہے جو ایک مرد اور ایک عورت کے درمیان واقع ہوا تھا۔ پیدا ہونے سے پہلے ہی اجتماعی زندگی کے بہت سے وہ ثمرات جو اس کی ماں اور اس کے باپ نے اپنے اندر جذب کیے تھے، موروثی صفات و خصائص کی صورت میں اس کے اندر پیوست ہو چکے ہیں اور وہ اسکی شخصیت کے نشو و نما پر اچھا خاصا اثر ڈالتے ہیں۔ ماں کے پیٹ سے باہر آتے ہی وہ ایک جماعت کے درمیان آنکھ کھولتا ہے اور اجتماعی زندگی اُس ساعت سے لیکر موت کی گھڑی تک پیہم اُس پر اثر ڈالتی اور اُس سے اثر قبول کرتی رہتی ہے۔ اگر اجتماعی ماحول کسی غلط نظام پر قائم ہو، اس کی آب و ہوا اصلاح کی بجائے فساد کو پرورش کرنے والی ہو، اس کی زمین خیر کے بجائے شر کے لیے سازگار ہو تو ان حالات میں اکثر و بیشتر افراد کی تکمیلِ ذات دشوار بلکہ محال ہے، یہاں تک کہ بسا اوقات اس ماحول میں وہ حالت پیدا ہو جاتی ہے جسے دیکھ کر ایک جلیل القدر پیغمبر پکار اُٹھتا ہے کہ رَبِّ لَا تَذَرْ عَلَى الْاَرْضِ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ دَيَّارًا۔ اِنَّكَ اِنْ تَذَرْهُمْ يُضِلُّوْا عِبَادَكَ وَلَا يَلِدُوْٓا اِلَّا فَاجِرًا كَفَّارًا۔ اس لیے یہ ناگزیر ہے کہ جماعت کو درست اور اجتماعی نظام کو پاک کیا جائے تاکہ بیشتر انسانی افراد کے لیے سازگار ماحول پیدا ہو جس میں ان کی شخصیتیں صحیح نشو و نما پا سکیں۔ حرام کی روٹی جس سے پرورش پائے ہوئے گوشت پوست کے لیے جنت حرام ہے اور جس کے حق میں نبی صادق و مصدوق نے خبر دی ہے کہ آتشِ دوزخ ہی اس کے لیے اولیٰ ہے، آخر کوئی فرد اس سے کیونکر بچے اور رزقِ حلال کہاں پائے جب کہ ایک غلط نظامِ معیشت نے رزق کے سارے چشموں کو گندہ کر دیا ہو؟ جاہلیت کے اخلاق، افکار اور اعمال جو انسان کے لیے ابدی خسران کے موجب ہیں، آخر کوئی شخص ان سے کس طرح محفوظ رہے جب کہ تمدن، معاشرت تعلیم، سب پر جاہلیت پورے زور کے ساتھ چھائی ہوئی ہو اور اس کا زہر وبائی سمیّت کی طرح سارے اجتماعی ماحول میں سرایت کر گیا ہو؟

معصیت

وسیلہ جس کے ساتھ کسی کمال کے حصول اور کسی شخصیت کے ارتقاء کا تصور ہی نہیں کیا جا سکتا۔ آخر کوئی شخص اس سے کہاں تک پرہیز کر سکتا ہے جب کہ ایک کافرانہ نظامِ سیاست نے کامل تسلط حاصل کر کے پوری پوری قوموں کو کفر اور ظلم اور فساد کی خدمت پر مجبور کر دیا ہو؟ پس فرد کی نجات و فلاح بہت مشکل بلکہ محال ہے اگر اس کی ترقی اور تکمیل کے راستے سے ان موانع کو دور نہ کیا جائے جو ایک بگڑی ہوئی جماعت اور ایک فاسد نظامِ اجتماعی کی بدولت پیدا ہوتے ہیں، اور ایک ایسا صالح اجتماعی نظام نہ قائم کر دیا جائے جو اس کی تکمیل اور ترقی میں مددگار ہو۔

یہ اس معاملہ کا ایک پہلو ہے۔ اور اسی کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کی ترقی اور تکمیل کا راستہ ہی اجتماعی زندگی کے اندر رکھا ہے نہ کہ اس کے باہر۔ فرد کی وہ امتحان گاہ جس میں اسے اپنی لیاقت یا نالائقی ثابت کرنی ہے۔ اور جس میں کامیابی یا ناکامی ہی پر آخرت میں اس کی فلاح و خسران کا مدار ہے، کسی خلوت کدے یا کسی سنسان جنگل میں واقع نہیں ہے بلکہ حیاتِ اجتماعی کے عین منجدھار میں واقع ہے۔ اس کو اکیلا نہیں رکھا گیا ہے بلکہ دوسرے انسانوں کے ساتھ بے شمار تعلقات کے رشتوں میں باندھ دیا گیا ہے۔ وہ کسی کا بیٹا، کسی کا بھائی، کسی کا شوہر، کسی کا باپ، کسی کا دوست، کسی کا دشمن، کسی کا ہمسایہ، کسی کا اجیر، کسی کا مستاجر، کسی کا حاکم، کسی کا محکوم، کسی کا بائع، کسی کا مشتری، کسی کا امین، کسی کا مؤتمن بنایا گیا ہے۔ اور اس کا امتحان ہی اس امر میں ہے کہ ان تعلقات میں بندھ کر، ذمہ داریوں اور امانتوں کے بوجھ سے لد کر، خوف اور لالچ، محبت اور غضب، امیدوں اور مایوسیوں کے ماحول میں رہ کر وہ کس طرح اللہ کے عائد کردہ حقوق اور فرائض ادا کرتا ہے، کس طرح اس کے مقرر کردہ حدود پر قائم رہتا ہے، کس طرح خلافت کے اس منصب سے عہدہ برا ہوتا ہے جو اس کے سپرد کیا گیا ہے، کن صفات کا اکتساب کرتا ہے، کن خصوصیات کو اپنے اندر نشوونما دیتا ہے اور اپنی سیرت و کردار کے کیسے نقوش دنیا میں چھوڑ کر جاتا ہے۔ نیکی کا جو تصور اسلام پیش کرتا ہے وہ ہر معنی سے خالی ہو جاتا ہے اگر فرد کو اجتماعی زندگی سے الگ کر دیا جائے۔ جس شخص نے تمدنی تعلقات کے جتنے کم شعبوں میں قدم رکھا ہے اور جتنی کم ذمہ داریاں لی ہیں، اس نے گویا اسی قدر کم پرچوں میں امتحان دیا ہے اور اس لحاظ سے اپنی شخصیت کو اتنے ہی پہلوؤں میں تکمیل کے مواقع سے محروم کر لیا ہے جتنی کہ

جس نے خلوت میں رہبانیت کی زندگی گزاری اس نے اپنے امتحان کے اکثر و بیشتر پرچے سادہ اوراق کی صورت میں بھیج دیئے جن پر وہ سرے سے کوئی نمبر پانے کا مستحق ہی نہیں ہے۔

اور بات صرف اتنی ہی نہیں ہے کہ فرد کی تکمیلِ ذات اجتماعی زندگی کے اندر ہی ہو سکتی ہے، بلکہ اس سے بڑھ کر یہ حقیقت ہے کہ اللہ تعالیٰ کے بیشتر اور بزرگ تر احکام سرے سے تشنۂ تعمیل رہ جاتے ہیں اگر انسانی اجتماع کی زمامِ کار اہلِ خیر کے ہاتھ میں نہ ہو۔ تمدن اور سیاست اور معیشت کی عنانِ اقتدار پر باغیوں کا قبضہ ہونے کے معنی یہ ہیں کہ خدا کی شریعت معطّل رہے، اس کی زمین میں صلاح کے بجائے فساد پھیلے، اس کی خلق میں امر بالمعروف کی جگہ امر بالمنکر ہو اور نہی عن المنکر کی بجائے نہی عن المعروف ہونے لگے یہ وہ حالت ہے جس سے بڑھکر اللہ کو مبغوض کوئی چیز نہیں، اور کسی شخص کا اس حالت میں رہتے ہوئے یہ توقع رکھنا کہ وہ خلوت کے مراقبوں اور ریاضتوں سے، یا نیکی اور تقویٰ کے چند مظاہر سے، یا ان احکام کی تبلیغ سے جو کفار کے لیے نامرغوب نہ ہوں، اپنی ذات کی تکمیل کر سکے گا، محض ایک خام خیالی ہے۔ ان حالات میں تکمیلِ ذات اور ارتقاءِ شخصیت کا ایک ہی راستہ ہے اور وہ یہ ہے کہ فرمانروائی کے مقام سے خدا کے باغیوں کو ہٹانے کی کوشش کی جائے اور سعی و جہد کی ساری قوتیں اس مقصد میں صرف کر دی جائیں کہ خدا کے ملک میں اس کی شریعت جاری ہو، اس کی زمین فساد سے پاک ہو کر خیر و صلاح سے بھر جائے، اور اس کی خلق میں حکم معروف کا چلے اور منکر ضابطۂ تعزیرات میں جگہ پائے۔

اس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ جماعت اور اجتماعی زندگی کی اسلام میں کتنی بڑی اہمیت ہے، لیکن اس سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ اصل اہمیت فرد ہی کو حاصل ہے، کیونکہ اجتماعی صلاح کا قیام اور اجتماعی فساد کی بیخ کنی افراد ہی کی فلاح و ترقی کے لیے مطلوب ہے۔

اس کے بعد یہ کہنے کی کوئی حاجت باقی نہیں رہتی کہ تمام نظاماتِ فکر و عمل سے بڑھ کر اسلام انفرادی اصلاح و تزکیہ کو اہمیت دیتا ہے۔ اس کا نقطۂ نظر اُن نظامات سے بھی مختلف ہے جو جماعت

سے قطع نظر کر کے فرد کو مجرد فرد ہونے کی حیثیت سے لیتے ہیں اور اجتماعی زندگی سے الگ تھلگ رکھ کر اس کو روحانی ارتقاء کے مدارج طے کرانا چاہتے ہیں۔ اور اُن نظامات سے بھی جو فرد کی انفرادی حیثیت کو نظر انداز کر کے اس کی ذات کو محض جماعت کی خاطر اہمیت دیتے ہیں اور افراد کو صرف اس لیے تیار کرنا چاہتے ہیں کہ کسی اجتماعی نصب العین کے حصول میں ان کی تربیت یافتہ قوتوں کو استعمال کرنا ہے۔ ان دونوں نقطہ ہائے نظر سے الگ اسلام کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ نوعِ انسانی کا ایک ایک فرد اپنی انفرادی حیثیت میں خدا کے سامنے جواب دِہ ہے اس لیے ہر ایک فرد کو فرداً فرداً خدا کے امتحان میں کامیابی حاصل کرنے کے لیے تیار ہونا چاہیے، مگر چونکہ خدا کے سامنے اس کی جوابدہی بہت بڑی حد تک اجتماعی حقوق، فرائض اور ذمہ داریوں ہی سے متعلق ہے، اور آخری امتحان کی کامیابی کے لیے اس کا تیار ہونا بجائے خود بھی اجتماعی صلاح و فلاح پر منحصر ہے، اور خدا کی رضا حاصل کرنے میں وہ کامیاب نہیں ہو سکتا جب تک وہ اپنی حدِ استطاعت میں فساد کو مٹانے اور خدا کے احکام اس کی زمین اور اس کی خلق پر جاری کرنے کا وہ فرض انجام نہ دے جو خلیفہ ہونے کی حیثیت سے اس پر عائد کیا گیا ہے، لہٰذا فرد کی تیاری محض اپنی ذاتی اصلاح ہی کی حد تک نہ ہونی چاہیے بلکہ اس درجہ کی ہونی چاہیے کہ وہ غیر صالح اجتماعی نظاموں سے لڑ سکے اور ایک صالح اجتماعی نظام کو قائم کرنے اور قائم رکھنے کا بل بوتا اس میں پیدا ہو جائے۔

یہی وجہ ہے کہ اسلام نے افراد کے تزکیۂ نفس اور تعمیرِ سیرت کے لیے وہ نقشہ بنایا ہے جو تمام دوسرے نقشوں سے اپنے مقصد میں بلند تر، اپنے نقطۂ نظر میں وسیع تر اور اپنی جزرسی میں باریک تر ہے۔ اگر مختصر اور جامع الفاظ میں کوئی اس نقشے کی تعریف کرنا چاہے تو غالباً سب سے زیادہ موزوں تعریف یہ ہوگی کہ اسلام کے پیشِ نظر ایسے انسان تیار کرنا ہے جو متخلق باخلاق اللہ ہوں، صحیح معنوں میں خلیفۃ اللہ بن کر زمین میں کام کریں اور اس کام کے صلہ میں اللہ کے تقرب سے سرفراز ہوں۔

مگر صدیوں کے انحطاط سے مسلمانوں کے اندر جہاں اور بہت سے تغیّرات ہوئے ہیں، تزکیۂ نفس کے باب میں بھی ان کا تصوّر اصل اسلامی تصوّر سے بہت کچھ مختلف ہو گیا ہے۔ ان کے مقصد

میں بھی تغیر آگیا ہے، نقطۂ نظر بھی محدود ہوگیا ہے، اور تزکیۂ نفس کے طریقے بھی اُن طریقوں سے مختلف ہوگئے ہیں جو عہدِ نبوت میں اختیار کیے گئے تھے۔ اس کا نتیجہ ہے کہ تزکیۂ نفس کے بڑے بڑے ادارے اور سلسلے مدتوں سے قائم ہیں اور ان کی برکت سے بڑی بڑی پاکیزہ شخصیتوں کے انسان بھی پیدا ہوتے رہے ہیں، لیکن اس پیمانے کے انسان ابھی تک تیار نہ ہوسکے جو جاہلیت کی راہوں پر دنیا کو چلانے والی زبردست قوتوں کے مقابلہ میں اُٹھیں اور اُن سے زور آزمائی کرکے اسلام کو دنیا کا رہنما و کارفرما دین بنانے کی کوشش کریں۔ اور یہ تو خیر بہت بڑا کام ہے، یہاں تو ایسے انسان بھی فراہم نہ ہوسکے جو کم از کم اتنا ہی کرسکتے کہ اسلام کے دائرۂ نفوذ و اثر میں جاہلیت کی قاہرانہ پیش قدمی کو روک دیتے۔ بڑے بڑے نفوسِ زکیہ موجود تھے اور موجود ہیں جو اپنے علم اور اپنی دیانت، اپنی پرہیزگاری اور اپنی پاکیزہ زندگی کے لیے یقیناً خراجِ تحسین کے مستحق ہیں، لیکن ان نفوس کی موجودگی ہی میں جاہلیت اپنی تلوار سے، اپنے قلم سے، اپنے علوم و فنون سے، اپنی تہذیب اور اپنے تمدن سے نہ صرف دنیا کو بلکہ خود مسلمان ملکوں اور قوموں کو بھی فتح کرتی چلی گئی ہے اور چلی جارہی ہے۔ آخر اس کمزوری کا کوئی سبب تو ضرور ہے، اور جو سبب بھی ہے اس کی تحقیق میں بے جا عقیدت مانع نہ ہونی چاہیے۔

ہمارے ہاں ایک بڑے گروہ کے نزدیک تزکیۂ نفس کا مقصد یہ رہا ہے کہ اسی زندگی میں مشاہدۂ حق نصیب ہوجائے اور ایمان بالغیب کے مقام سے ترقی کرکے ایمان بالشہادت کی دولت حاصل ہو۔ ظاہر نظر میں یہ ایک بلند ترین اور پاکیزہ ترین مقصد ہے، لیکن قرآن نے کہیں ہم کو یہ تعلیم نہیں دی کہ ہم اسے مقصود قرار دے کر اپنی کوشش اس راہ میں صرف کریں۔ بلکہ اس کے برعکس اگر ہم بطورِ خود اسے مقصود قرار دے بھی لیں تو قرآن ہمیں یقین دلاتا ہے کہ یہ گوہرِ مقصود اس زندگی میں نبی کے سوا کسی کے ہاتھ نہیں آسکتا۔ عٰلِمُ الْغَيْبِ فَلَا يُظْهِرُ عَلٰى غَيْبِهٖ اَحَدًا اِلَّا مَنِ ارْتَضٰى مِنْ رَّسُوْلٍ فَاِنَّهٗ يَسْلُكُ مِنْ بَيْنِ يَدَيْهِ وَمِنْ خَلْفِهٖ رَصَدًا لِّيَعْلَمَ اَنْ قَدْ اَبْلَغُوْا رِسٰلٰتِ رَبِّهِمْ (یعنی حقائقِ غیب کا جاننے والا اللہ ہے اور وہ اپنے غیب پر کسی کو مطلع نہیں کرتا بجز اس رسول کے جس کو اس نے خود منتخب کیا ہو، پھر وہ اس کے آگے اور پیچھے نگرانی

نگرانی کرنے والے فرشتے لگا دیتا ہے یہ معلوم کرنے کے لیے کہ ان رسولوں نے اپنے رب کے پیغامات پہنچا دیئے۔ اس سے معلوم ہوا کہ پردۂ غیب میں چھپی ہوئی حقیقتوں، یا بالفاظ دیگر مابعد الطبیعی حقیقتوں کے مشاہدے کی کوشش فضول بھی ہے، غلط بھی اور اس کے کامیاب ہونے کا بھی امکان نہیں ہے۔ انسان کو ان حقائق کے جتنے اور جس قدر علم کی ضرورت تھی اللہ نے وہ علم اپنے رسولوں کے ذریعہ سے دے دیا ہے اور یہ اللہ کا بڑا احسان ہے کہ اس طرح اُس نے انسان کو ان چیزوں کی تلاش و جستجو کی زحمت سے بچا دیا۔ اب انسان کا کام صرف یہ ہے کہ وہ رسولوں کے دیے ہوئے علم پر ایمان بالغیب لائے اور جو خدمات اس کے سپرد کی گئی ہیں انہیں اطمینان کے ساتھ انجام دینے میں لگا رہے لیکن اگر اس پر بھی کوئی شخص خواہ مخواہ یہ زحمت اٹھانا ہی چاہے تو اس کی حیثیت خدا کے بلائے ہوئے مہمان کی نہ ہوگی کہ اس کے لیے دروازے کھولے جائیں اور پردے اٹھائے جائیں، بلکہ اس کی حیثیت ایک نقب زن کی سی ہوگی جو خود روزن بنا کر اندر جھانکنا چاہتا ہو۔ سو اللہ کے حرم میں اس نقب زنی کی کوشش ظاہر ہے کہ کامیاب نہیں ہو سکتی۔ اگر بالفرض کوئی اُس حرم کی سرحد سے قریب پہنچ بھی گیا تو رسولوں کے لیے حفاظت و نگہبانی کا جو غیر معمولی انتظام کیا جاتا ہے اس سے تو وہ بہرحال محروم ہی ہوگا، اس لیے دور سے جو تھوڑی بہت حقیقت کی جھلک وہ دیکھیگا اُس میں نفس کی غلط فہمیوں، نظر کے دھوکوں اور شیاطین کی دراندازیوں کے بے شمار خطرات ہونگے جن کی بدولت عجب نہیں کہ ایمان بالشہادت کی نعمت پانے کے بجائے ایمان بالغیب کی دولت سے بھی ہاتھ دھونا پڑ جائے۔

اس سے فروتر تزکیۂ نفس کا جو مقصد بتایا جاتا ہے وہ روحانی ترقی ہے، مگر یہ "روحانی ترقی" کچھ ایسی مبہم اور پُراسرار چیز ہے کہ تمام عمر اس بھول بھلیاں میں گشت لگانے کے بعد بھی آدمی کو کچھ معلوم نہیں ہوتا کہ وہ کس مقام پر پہنچا۔ اسکی اصطلاحیں، اس کی منزلیں، اسکے ثمرات و نتائج، سب مرموز ہیں جن کو ہم جیسے عامی کچھ نہیں سمجھ سکتے۔ ہمیں اگر کچھ نظر آتا ہے تو وہ صرف یہ کہ اس راہ میں جو منزلیں طے کی جاتی ہیں ان میں وہ منزل کبھی نہیں آتی جسے بلالؓ اور عمارؓ اور صہیبؓ نے طے کیا تھا اور نہ وہی منزل کبھی آنے کی توقع کی جا سکتی ہے جس کو ابوبکرؓ و عمرؓ نے طے کیا۔

اسلام کے مقصد سے قریب ترین مقصد اُن لوگوں کا ہے جو تزکیۂ نفس سے تقویٰ کا حصول چاہتے ہیں

(باقی صــ پر)

(بقیہ اشارات)

لیکن یہاں ایک دوسری مصیبت پیش آجاتی ہے، اور وہ یہ ہے کہ تقویٰ کے متعلق بالعموم لوگوں کا نقطۂ نظر بہت محدود ہو کر رہ گیا ہے۔ بیشتر اصحاب کے نزدیک تو تقویٰ سے مراد محض لباس، وضع قطع، نشست برخاست، اکل و شرب وغیرہ امور کے متعلق اس ظاہری نقشہ پر اپنی زندگی کو ڈھال لینا ہے جس کے جزئیات احادیث میں بیان ہوئے ہیں نیز چند مذہبی اعمال کی پابندی کرنے اور معمول سے کچھ زیادہ عبادات کر لینے سے تقویٰ کی تکمیل ہو جاتی ہے اس کا نتیجہ یہ ہے کہ جن لوگوں نے تقویٰ کی اس ظاہری شکل کو اختیار کر لیا ہے انہیں متقی کہا اور سمجھا جاتا ہے اور وہ خود بھی مطمئن ہو جاتے ہیں کہ انہوں نے اپنے اندر تقویٰ پیدا کر لیا ہے، حالانکہ فی الحقیقت روح تقویٰ کی ان میں بہت کمی ہوتی ہے اور بسا اوقات عملی زندگی کی آزمائشوں میں ایسی ایسی غیر متقیانہ حرکات اُن سے سرزد ہو جاتی ہیں جن کی بدولت تقویٰ کی اس ظاہری شکل کا بھرم بھی جاتا رہتا ہے۔ اس عام تصور سے بلند تر اور وسیع تر تصورِ تقویٰ جو خواص میں پایا جاتا ہے وہ بھی اس سے زیادہ نہیں ہے کہ انفرادی زندگی میں آدمی خدا ترس، عبادت گزار اور ذاکر و شاکر رہے معاملات میں دیانت، امانت، راستبازی اور حدود اللہ کا پابند ہو، اور دوسرے افراد کے ساتھ معاشرت میں خوش اخلاقی، ہمدردی، مواساۃ، انصاف اور حق رسانی کے طریقے پر عامل رہے۔ اس محدود تصور میں وسیع تر اجتماعی مسائل کے فہم و ادراک کی کوئی گنجائش نہیں ہوتی۔ اس لیے ہمارے بہترین صلحاء کے ہاں بھی جو تزکیۂ نفس کیا جاتا ہے اس کا فائدہ اس سے زیادہ کچھ نہیں ہوتا کہ خدا کی باغی حکومتوں کو پرہیزگار رعیت اور متدین ملازم بہم پہنچ جائیں۔ خود ان کی تعلیم و تربیت جیسی رعایا اور جیسے ملازم فراہم کرتی ہے ان میں اور تو سب قابلیتیں ہوتی ہیں، مگر ایمانداری اور راست بازی نہیں ہوتی اس لیے وہ اُن کا اچھا خاصا نقصان بھی کر دیتے ہیں۔ یہ کمی ہمارے تزکیۂ نفس کے اداروں سے پوری ہوتی ہے جو غلبۂ کفر کے لیے لڑنے اور نظام کفر کو چلانے کے لیے راستباز آدمی تیار کرتے ہیں اور کفر کی حکمرانی کے لیے وہ رعیت پیدا کرتے ہیں جو اس کے لیے کم سے کم موجب پریشانی ہوتی ہے۔ حد یہ ہے کہ ہمارے ہاں اگر کوئی شخص کھلم کھلا کسی غیر الٰہی نظام کے قیام میں جان لڑاتا ہو تب بھی وہ جوں کا توں متقی رہتا ہے بشرطیکہ اس کی زندگی میں تقویٰ کے وہ جزئیات پائے جاتے ہوں جن کا اوپر ذکر ہوا ہے۔ یہ سب لازمی نتائج ہیں اس محدود تصور کے جو ہمارے مذہبی طبقوں میں تقویٰ اور تزکیۂ نفس کے متعلق خواص سے لیکر عوام تک پھیلا ہوا ہے۔